بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

## (۱)

سرزمین نجد و حجاز سے یوں بھی ہمیں بے پایاں محبت ہے کہ اسی ریگ زار سے ایمان و عرفان کا وہ چشمۂ مقدس اُبلا جس کے فیضان نے تمدّن کی بنجر کھیتیوں کو لالہ زار بنا دیا۔ فلاحِ انسانیت کی عظیم الشان تحریک محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امامت و قیادت میں یہیں نمودار ہوئی۔ اس تحریک کے نور کو دنیا کی جس قوم نے بھی اخذ کیا۔ اس کے افراد اپنے علم، اپنے اخلاق اور اپنے کارناموں کی وجہ سے آسمانِ تاریخ کے مہرو انجم بن گئے اور جن مللِ خانماں خراب نے اس سے رُوگردانی کی، وہ عجائب خانۂ عبرت کی زینت بن گئیں۔

مزید یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سعودی عرب کے موجودہ حکمران اور وہاں کے باشندے پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے وہ ہمیں محبت بھری نگاہ اُمید سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم تحریک پاکستان سے لے کر اب تک کے اعلانات کے بموجب نظامِ اسلامی کا احیاء کرنے والے ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان پورے عالمِ اسلام کے لیے ایمانی اور مادّی ہر دو لحاظ سے قلعہ بن جائے گا۔ اور بار بار پیش آنے والی رکاوٹوں کے باوجود انشاء اللہ ایسا ضرور ہو گا۔

پاکستان کو جب کبھی کوئی مصیبت پیش آئی تو سعودی عرب کے عمائد، علماء اور عوام سبھی مضطرب ہو گئے، اور حرمین میں ہمیشہ بہ الحاح اس سرزمین کی سلامتی و عافیت کے لیے دعائیں مانگی جاتی رہیں جو اسلامی نظام کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کا قیام ہو، رابطۂ عالم اسلامی کی تاسیس، یا حج کی انتظامی مجلس سب میں پاکستان کو نمایاں طور پر حصّہ دار بنایا گیا۔ آج تک دعوتِ دین، فقہ، سائنس اور ٹیکنالوجی، اقتصادیات، بلاسود بنک کاری، نظامِ تعلیم، مساجد وغیرہ کے متعلق جو کانفرنسیں بُلائی جاتی رہی ہیں ان میں ہمیشہ پاکستانی مندوبین کو دعوت نامے بھیج کر شریک کیا گیا ہے۔ دوسری طرف سعودی عرب سے

پاکستان میں سرکاری اداروں کے رجالِ خاص اور علماء کبھی کبھی منفرداً اور کبھی وفد کی صورت میں آتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تحریک تضامنِ اسلامی کے نقیبِ اوّل خود شاہ فیصل نے اپنی شہادت سے کچھ ہی وقت پہلے پاکستان کا دورہ کیا۔ آج اسلام آباد میں عظیم جامعہ شاہ فیصل بن رہی ہے جو ہمیشہ شاہِ شہید کی محبتِ پاکستان کی یادگار کے طور پر ہمارے سامنے رہے گی۔ اس مسجد کے گراں بہا مصارف پاکستان کے اس مرحوم محسن نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔

---

ہمارے اس برادر ملک سعودی عرب سے محبت و خلوص کی سوغات لیے ابھی ابھی ایک وفد آیا تھا۔ اس وفد کے آنے سے دینی جذبات کی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں۔

اس وفد کے سربراہ عزت مآب الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آلِ الشیخ تھے جو بیت اللہ شریف کے امام و خطیب ہیں اور امامِ حج کی حیثیت سے خطبۂ حج بھی دیتے ہیں۔ موصوف کی اقتداء میں دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان نمازیں ادا کرتے ہیں اور آپ کے خطبہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ عزت مآب کا تعلق سعودی عرب کے اس ممتاز گھرانے سے ہے جس کے ہاتھوں سعودی عرب میں انقلاب برپا ہوا اور انگریزوں کی سازباز کے سارے جال توڑ کر آلِ سعود برسراقتدار آئے۔ محترم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ کا خاندان آج بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دعوتِ دین اور علمِ دین کے لحاظ سے اسی کو فوقیت حاصل ہے۔

وفد کے دوسرے رکن جناب الشیخ سعید الجندول تھے جو سعودی عرب کے محکمہ تعلیم میں خاص منصب رکھتے ہیں۔

وفد کے تیسرے رکن پروفیسر ڈاکٹر احمد توتونجی تھے جو جنرل ورلڈ اسمبلی مسلم یونیورسٹی کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دینی علوم کے ساتھ جدید جہانِ افکار سے بھی واقف ہیں۔ آپ دنیا میں دورے کر کے مسلم نوجوانوں سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ ان تک دعوتِ دین کا پیغام پہنچاتے ہیں، اُن کو متحرک اور منظم کرتے ہیں، اُن سے خط و کتابت رکھتے ہیں، ان کی تنظیموں اور اداروں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچاتے ہیں اور اُن کو کانفرنسوں میں مدعو کرتے ہیں۔

---

وفد کا کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ ہر جگہ استقبالیے اور ضیافتیں

ہوئیں۔ مسجد نیوٹاؤن کراچی، شاہی مسجد لاہور، جامعہ منصورہ میں امام کعبہ نے نمازوں کی امامت کی۔ لوگ ہجوم کر کے آئے اور عالم اسلام کی ایک قابل قدر شخصیت کے پیچھے نماز پڑھنے کا خصوصی ثواب حاصل کیا۔ خاص طور پر مسجد نیوٹاؤن کراچی میں جمعہ کی نماز کے لیے اتنا ہجوم تھا کہ مسجد کے تمام حصے، اس کی چھت، آس پاس کی سڑکیں اور گلیاں نمازیوں سے بھر گئیں۔ تقریبوں میں سپاسنامے پڑھے گئے یا خیر مقدم کے کلمات کہے گئے۔ اُن کے جواب میں جو تقریریں رئیس الوفد عزت مآب الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ امام حرم مکہ اور اُن کے معزز رفقا نے کیں۔ ان کا ماحصل یہ تھا کہ ہم نے مسلمانانِ پاکستان کے جذبۂ دینی کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سُنا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہم اس محبت و خلوص کے لیے بہت شکر گذار ہیں جس کے ساتھ جگہ جگہ ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔ امام کعبہ کا ارشاد تھا کہ اہلِ پاکستان اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو جہاد کر رہے ہیں ہم دل و جان سے اس کے ساتھ ہیں۔ سعودی عرب کے بعد پاکستان ہمارا دوسرا وطن ہے۔

عزت مآب امام کعبہ نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کی۔ اس موقع پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آپ نے چالیس سال تک جو کام کیا ہے اب اس کے برگ و بار نمودار ہو رہے ہیں۔ پورے قرآن کی تلاوت کا کیسٹ ٹیپ سیٹ موصوف نے ہدیہ کیا۔ امام صاحب نے مولانا کو یاد دلایا کہ جب آپ سفر ارض القرآن کے لیے تشریف لے گئے تھے تو ملاقات ہوئی تھی۔

---

یہ وفد اس تقریب کی شرکت سے بہت ہی خوش ہو کر لوٹا جو پنجاب یونیورسٹی یونین نے یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں منعقد کی تھی۔ نوجوانوں کا ہجوم اور ان کا جوش و خروش دیکھ کر انہیں بخوبی یہ اندازہ ہو گیا کہ پاکستان کی نئی نسل جو تعلیم گاہوں میں تیار ہو رہی ہے وہ تحریک اسلامی کے علمبرداروں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔ اس کا بار بار انہوں نے مختلف مواقع پر اظہار کیا۔

یاد رہے کہ یہ دورہ نہ تو حکومت پاکستان کی دعوت پر تھا، اور نہ اس کے لیے سابق حکومت کی طرح اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو جمع کرنے کے انتظامات کیے گئے تھے، نہ سرکاری ملازمین اور سفید کپڑوں میں خاص سروسز کے افراد کو حاضرین بنا کے لایا گیا، اور نہ پارٹی کے انتظام سے بیگار میں پکڑے ہوئے ٹرکوں اور بسوں میں لاد لاد کر دیہاتیوں کو اکٹھا کیا گیا۔

اندریں حالات وفد کا جو والہانہ استقبال ہوا اور جو محبت آمیز مجالس اور تقریبات اور دعوتیں منعقد ہوئیں

ان کی رُوح صرف خلوص تھا۔ اور جو کچھ ہوا وہ کم نہیں تھا۔

---

یہ دَورہ وفد نے اپنے پروگرام کے تحت خود کیا تھا، جس کی منزل اوّل پاکستان تھا۔ اس کے بعد انہیں دنیا کے مختلف حصّوں میں جانا ہے اور ہر جگہ دین کا پیغام پہنچانا ہے، ہر جگہ مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینا ہے، اور ہر جگہ اسلامی تنظیموں سے خصوصی رابطہ پیدا کرنا ہے۔ سعودی عرب کی یہ خدمت بہت قابلِ قدر ہے کہ اس کے عمائد اور علماء اور اس کے بعض ادارے دنیا بھر میں دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ خود پہنچ پہنچ کر کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں، عالمِ اسلامی میں جذبۂ اتحاد کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب جبکہ یہ مبارک وفد پاکستان سے بھارت جا چکا ہے تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے احوال کو دیکھے سمجھے، اور پھر آگے دوسرے ملکوں میں جائے گا۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس وفد کو اپنے مبارک مقاصد میں کامیاب کرے اور سفر کو آسان بنائے۔

---

## (۲)

اقبال کے سال پیدائش[1] سے ٹھیک ایک صدی بعد "سالِ اقبال" منایا گیا۔

پہلے تو نہیں، مگر اس سال یہ سوال بڑی اہمیت سے میرے ذہن میں اُبھرا کہ اقبال کو جو وسیع محبوبیت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا راز کیا ہے۔ اپنے ملک یا اپنی قوم میں کسی کا چرچا ہو جانا بھی بڑی بات ہے، مگر یہاں تو صورتِ معاملہ یہ ہے کہ شروع ہی سے اقبال پر دانشورانِ مغرب نے توجہ دی اور یہ توجہ اب تک مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ پھر مسلم ممالک اور اشتراکی ممالک سبھی میں اقبال کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اقبال کے محض دورِ حیات میں اس کے اعلیٰ اور وسیع روابط کی بنا پر کچھ حلقوں میں دلچسپی رہتی اور پھر وہ آہستہ آہستہ غائب یا کم ہو جاتی۔ پھر اقبال نے نہ تو بطور خود اس کی تحریک کی کہ کچھ لوگ اس کے نام اور کام اور پیغام کو اچھالنے والے ہوں اور نہ اقبال

---

[1] علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش سے متعلق جو بحثیں میری نظر سے گذری ہیں۔ ان کی بنا پر مجھے اطمینان نہیں ہے کہ علامہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس بات کو "غلط العام" بلکہ حقیقت میں "غلط الخواص" کی حیثیت سے سب کے ساتھ مجھے "برداشت" کرنا پڑا ہے۔ (ن۔ س)۔

کی زندگی میں سرکاری سطح پر اور نہ پاکستان بننے کے بعد اعلیٰ قومی سطح پر کوئی ایسا مؤثر اہتمام ہوا کہ اس شخصیت کا پھریرا گوشے گوشے میں اڑایا جائے۔ کوئی پروپیگنڈہ مشینری بھی نہ تھی کہ مغربی اور مسلم ممالک کے جرائد میں کچھ لوگ اقبال کو موضوع بنا کر اشاعتی مہم جاری رکھتے۔ قوم نے اقبال کو اس رسمی انداز میں بھی نہیں لیا جسے ہیرو شپ یا اکابر پرستی کہتے ہیں۔ اس طرح کسی مصنوعی تدبیر کے بغیر ایک شخص کو دنیا بھر سے محبت و احترام کا خراج ملتا ہے۔

شعراء پہلے بھی اچھے سے اچھے ہو گذرے اور اب بھی موجود ہیں، جن سے دنیا بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ عظیم درجے کے فلسفی بھی ہو گذرے ہیں اور آج بھی یکے بعد دیگرے نمودار ہو رہے ہیں، پیغام رکھنے والے مصلحین بھی ہر قوم میں ابھرے، اور اب بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر کسی شاعر، کسی فلسفی اور کسی مصلح کو یہ مقام نہ ملا کہ جگہ جگہ نہ صرف اسے پڑھا سمجھا جا رہا ہو، بلکہ اس کے لیے ایک والہانہ جذبۂ محبت و احترام بھی موجود ہو۔

اس حیرت انگیز اور پراسرار حقیقت کو سمجھنے کے لیے میں نے جو تجزیہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

۱۔ علامہ مرحوم کا ایک گراں بہا کارنامہ یہ ہے کہ مغربی لٹریچر اور مغربی فلسفہ اور مغرب کے پولیٹیکل اور سوشل ڈھانچے کا بھرپور عمیق مطالعہ خود مغرب کی سحر آگیں فضا میں رہ کر کرنے کے بعد وہ تہذیب نو کے سرابوں میں ڈوبا نہیں رہ گیا جن میں غوطہ لگانے والے اہل سیاست، اہل قانون اور اہل ادب و صحافت دوبارہ ابھر نہ سکے، بلکہ اقبال پہلا ممتاز مفکر ہے جو ان سرابوں کی طلسماتی موجوں کے داموں کو توڑ کر نہ صرف زندہ و سلامت نکل آیا بلکہ اس کی سوئی ہوئی مسلمانیت بیدار ہو گئی۔ اور وہ دنیا کے سامنے تہذیب مغرب کے خلاف اپنا چارج شیٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔

اقبال نے دورِ حاضر سے فائدہ بھی اٹھایا، ابتدا میں قدرے مرعوب بھی ہوا، مگر اس کا اصل کردار یہی ہے کہ اس نے دورِ حاضر کے تہذیبی فساد کو نمایاں کیا، اس کے کمزور پہلوؤں پر شدید گرفت کی اور اس کے تضادات کو عالم آشکارا کیا۔

اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ اس نے مادیت کی چکی میں پستے ہوئے انسان کی مظلومی کو سمجھا اور اس سے دل کی گہرائیوں سے ہمدردی کی۔ اس نے نسل و وطن کی تفریقوں اور طبقاتی تقسیموں کو بے نقاب کیا اور بادشاہت، آمریت اور جمہوریت کی اذیت ناکیوں کا نوحہ گایا۔ اس نے دولت، عورت، محنت، جنگ اور صلح کے مسائل چھیڑے۔ اس نے انسان کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کے راگ الاپے۔

۲۔ علامہ نے فلسفہ پڑھا اور اس میں محض ایک امتحان پاس کرنے والے طالب علم کی سی دلچسپی نہ لی بلکہ ذاتی دلچسپی کے تحت نصابیات کے دائرے سے باہر نکل کر انسانی فکر و قیاس کے سمندر کو کھنگالا۔ اور جب وہ اس سمندر سے

باہر نکلا تو خود ایک سمندر تھا۔ مغربی فلسفے کے لیے اس کے اندر اگر کوئی مرعوبیت تھی بھی تو چند ہی خواصیوں کے بعد ختم ہو گئی۔ اور وہ اس فلسفے کے خلاف ہمہ تن ایک صدائے احتجاج بن گیا۔ مگر یوں نہیں کہ مغربی فلسفے سے محض بیزاری یا اختلاف کا اظہار کر دیا ہو، بلکہ از سر نو ایک فلسفے کی بنیاد رکھی اور مروجہ فلسفے کے اکابر و اساطین کے حوالوں سے بات اٹھائی۔ سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو سامنے رکھا اور اپنے ایمان کی روشنی میں فکر و قیاس کی وہ نئی راہیں کھولیں جن پر چل کر خدا، وحی، نبوت، رسالت، ختم نبوت، حشر، نشر جیسے حقائقِ غیبیہ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ عقل سرِ انقیاد جھکا دیتی ہے۔ سائنس، فلسفے اور ایمان کا جو امتزاج تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب اقبال کے دورِ ما بعد یا دورِ تکمیل کی آئینہ دار نہیں ہے اور اس میں پیش کردہ بہت سے افکار سے خود اقبال نے اختلاف کیا ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے میدان میں اپنے طرز کی واحد کتاب ہے، اور شاید اب تک جدید مسلم فلسفیوں میں سے کسی نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارے یہاں تاثر یہ تھا کہ فلسفہ پڑھنے والے لوگ ملحد ہو جاتے ہیں۔ یہ قدرے صحیح بھی تھا، کیونکہ جدید فلسفہ تمام تر ملحدانہ مادیت کے مرکزی نقطے کے گرد مرتب ہوا تھا۔ اقبال نے ملحدانہ فلسفے کے متوازی خدا پرستانہ فلسفے کی راہ نکالی۔ اقبال کا یہ کام متکلمین اسلام سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ وہ فلسفہ نو تشکیل نہیں کرتے تھے۔ اور عیسائی فلسفیوں سے بھی مختلف ہے، کیونکہ وہ فلسفے کے نام سے بالعموم متکلمینِ عیسائیت کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ان کے سامنے مذہبی مواد بڑا محدود تھا اور پرواز کے لیے فضا تنگ تھی۔

اس کتاب[1] میں اقبال کی اہم ترین بحث زمان (اور مکان) کی بحث ہے۔ وہ اپنا فلسفہ زمان مرتب کرنے کے لیے عرصہ دراز تک پڑھتے رہے۔ قدیم علماء کی کتابوں میں مواد تلاش کرتے رہے، معاصر اہل علم سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر جب پوری تیاری کے ساتھ مسئلہ چھیڑا تو اس شان سے کہ زمان کی تلوار سے مادیت کی جڑ کاٹ دی۔ یہ کتاب سیکولرازم کے خلاف گویا ایک اعلانِ جنگ ہے۔

اقبال کے اس کام نے اہل مغرب کو حیران کر دیا۔ یوں بھی ہمارے معاشرے کے گنبد افکار سے اہل مغرب کو

---

[1] دوسری طرف اقبال کا متوازی کام بعنوان مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی، اسلام کے اساسیات کو ترتیب اور جامعیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے انداز بیان سے بھی فلسفہ جھلکتا ہے۔ یہ مثنوی بھی اہل مغرب کی توجہات کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے انہیں اسلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اپنی ہی صدائے بازگشت سُنائی دیتی تھی اور تمام کا تمام جدید تعلیم یافتہ طبقہ سازِ محکومی سے تقلید کے راگ چھیڑ رہا تھا۔ ایسے میں اقبال کا آزادانہ نغمۂ تنقید و تجدید اُن کے لیے جاذبِ توجہ ہوا۔ نقالوں اور خوشامدیوں اور مقلدوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے نواب کبھی کبھی آزاد مردوں کی آواز کو ترس جاتے ہیں۔ قدر ہمیشہ زندہ ضمیر اور بیدار دل لوگوں کی ہوتی ہے۔

۳۔ نوعِ انسانی کے دردناک مسائل — جنگ و تصادم، بھوک، مزدوروں سے بے انصافی، قوموں کی غلامی۔ استعماری قوتوں کی لوٹ کھسوٹ، بیماریوں کا فروغ، جہالت کی عمومیت، نسل و وطن کی کھینچا تانیاں، اور خاندان کی تباہی، عورتوں کا ناجائز استعمال، جدید معاشرت کی گندگیاں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے مسلسل سوچا کہ راہ نجات کیا ہے۔ پھر بغیر کسی اندھے تعصب کے تمام جدید نظریوں اور نظاموں کی جانچ پرکھ کے بعد اسلام پر انگلی رکھ دی کہ صرف یہی ایک نظام فلاحِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

پھر بغیر کسی خوف کے اپنی مؤثر و دلنشیں شاعری میں اسلامی عقاید، احکام، عبادات، اخلاقیات اور سیاسی، معاشی اور تمدنی مسائل کو سمو دیا۔ شاعری کے لیے مقصد کو لازمی قرار دیا، مگر مقصد کو شاعری کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ کہیں لذتِ سخن مجروح نہ ہونے پائی بلکہ ایک نئے طرز کا شکوہِ سخن پیدا ہو گیا۔ بات کہنے کے ایسے ایسے اسلوب ایجاد کیے کہ غور کرنے پر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی واعظ یا فقیہ کی طرح نماز پڑھنے کا وعظ نہیں کہتے بلکہ صرف اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان مختصر الفاظ میں بڑا وسیع استدلال موجود ہے۔ یہ بات شعر کے پس منظر میں ہے کہ ذوقِ پرستش تو آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ اس ذوق کی تسکین اگر خدائے واحد کی عبادت سے نہ کی جائے تو پھر یہاں سیکڑوں خدا خراجِ عبادت لینے کے لیے نکل آئیں گے۔ توحید ان سب سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔

میں نے جا بجا بغور دیکھا ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں، نیز تراکیب اور تشبیہوں کے استعمال میں جو کمال اقبال کے ہاں ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔ شعرِ اقبال میں عجب ساحرانہ اثر ہے۔ اقبال نے ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا پورا قلعہ مسمار کر کے اپنا جھنڈا گاڑا ہے۔

پھر اس شخص کے پڑھنے کا انداز بھی وہ تھا کہ شاہی مسجد میں جس دن شہیدانِ طرابلس سے متعلق مسلمانوں کے اجتماع میں اپنی نظم سُنائی، اُس دن آخری شعر (مصرعہ: طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں) (باقی بر صفحہ ۴۱)

(بقیہ اشارات) سُن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر روئے، دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے۔ فرش پہ تڑپتے دکھائی دیے۔ بہترین رُومانی شاعری تو کیا، کیا جدید انقلابی شاعری بھی یہ سماں پیدا کر سکتی ہے؟

اقبال نے برصغیر کے پراگندہ فکر مسلمانوں کو اپنی شاعری سے سمیٹنے کی، (بہ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را) کوشش کی، ان میں اُمید پیدا کی، دین و سیاست کی ہم آہنگی کا درس دیا، خودی کا فلسفہ پیش کر کے اُن کے اندر قوتِ عمل کو پیدا کیا، وحدت الوجودی تصوف کے خواب آور اثرات سے اُن کو نکالا، قادیانیوں کے عقیدۂ اجرائے نبوت کا توڑ کیا، رہبانیت کی بیخ کنی کی، فرقہ وارانہ کشاکش کی دلدل سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ اُن کے سامنے مسلم قومیت کا جداگانہ تصور پیش کیا۔ اس تصوّر کے مطابق برصغیر میں مسلم ریاست کی تشکیل کی دعوت دی۔ اس ریاست کے بننے سے پہلے اس میں قائم ہونے والے نظامِ اسلامی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تشکیلِ فقہ جدید کی دعوت دی، خود فقہ اور شریعت کے مطالعہ کا آغاز کیا، دارالاسلام پٹھانکوٹ میں اپنے تجویز کردہ مسلم کلچرل ادارے کے قیام کی کوشش کی، سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کی قیادت کرنے کے لیے قائدِ اعظم کی پشت پناہی کی۔ فقہی امور میں رہنمائی سید سلیمان ندوی مرحوم اور دوسرے نامور علماء سے لی۔ اسلام کو جدید دور میں پیش کرنے اور مغربی علوم اور دینی علوم کی یکجائی سے مسلمان نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرنے کے لیے نگاہِ انتخاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر رُکی۔ سیاست میں براہ راست بہت ہی کم دخل دیا۔ البتہ بالواسطہ طور پر اثر انداز ہونے کی مختلف کوششیں مسلسل کیں۔ انتہائی سادہ زندگی گذاری۔ ضمیر کا کبھی سودا نہیں کیا۔ نت نئے موقف اختیار نہیں کیے۔ عام کردار ہر قسم کے اسکینڈلوں سے بے داغ رہا۔ اگرچہ بعض لوگ عنفوانِ شباب کے دَورِ طالب علمی کے متعلق چھان کرید میں لگے رہتے ہیں، مگر کسی لفظ یا کسی فعل سے کوئی ایسی چیز ثابت نہیں ہو سکی جسے شنیع کہا جا سکے۔ بس زیادہ سے زیادہ کچھ لوگ جو فوق العام حساسیت دکھاتے ہیں، وہ مضمون لکھ لکھ کر اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ بُو سی آتی ہے، کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی۔

اقبال نے مسلمانوں میں انقلابی جذبہ اُبھارنے کے لیے فارسی اور اُردو شاعری میں جو کام کیا ہے وہ وسیع ہے۔ مگر دو تین مثالیں دیکھیے جنھوں نے اس کی پیدا کردہ رَو کو عوام تک پہنچا دیا ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں ۔۔۔ یہی توحید تھی جس کو نہ میں سمجھا نہ تو سمجھا

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔۔۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز ۔۔۔ زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

تو یہ تھا اقبال!

قدرت نے اسے جس بڑے مقصد کے لیے ایک موثر و مقبول شخصیت بنایا۔ آج عالم اسلام میں لوگ قافلہ در قافلہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس پورے کے پورے اقبال کو، اور اصل اقبال کو سامنے رکھ کر کوئی بتائے کہ کیسے اسے اشتراکی یا اسلامی سوشلزم کا داعی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ رسولِ پاک کو جو مقام دیتا ہے وہ تاریخ اسلام کی جن درخشاں شخصیتوں کو اپنے قصرِ احترام میں سجا کر پیش کرتا ہے، اس نے زندگی میں جن لوگوں سے تعلق رکھا، جو اس کے دوست اور غمخوار تھے، جن لوگوں کو اس نے اپنا استاد و رہبر بنایا، جس طرح کے مشاغل رکھے، جن لوگوں سے وابستگیاں رکھیں، جس طرح کی زبان اور تراکیب کو پسند کیا، آخر ان ساری چیزوں کی شہادت کیا ہے۔

بہرحال مغالطہ انگیزوں کی اب تک کی مہمات جس طرح ناکام گئی ہیں، انشاء اللہ آئندہ بھی اقبال کی وسعت دار شخصیت کو کسی غلط سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکے گا۔

اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس چھتنار درخت کے نیچے کوئی سرو و صنوبر پروان چڑھ سکے۔ اقبال کے مخالفین ہمیشہ احساس کہتری میں مبتلا رہیں گے۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سرزمین پاکستان میں وہ کام کر ڈالا جائے جس کے لیے اقبال نے کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی" میں دن رات ایک کر دیے تھے۔ اور جسے ملت کا نصب العین اور اور برصغیر میں بننے والی مسلم ریاست کا مقصود قرار دیا تھا۔ کام تو ہو رہا ہے، مگر ایسے کام اگر سست رفتاری سے ہوں تو مخالف قوتوں کو ضرر رسانی کی مہلت مل جاتی ہے۔

آخری جملہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے اس بندے پر ہزار در ہزار رحمتیں نازل کرے جس نے تہذیب مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

---

## (۳)

اگر کسی دور کی تاریخ کا سارا عمل فطری طریق سے جاری ہو تو اسلامی نظامِ حیات اور اس کی برکات کا ظہور لازماً دعوتِ حق کے قدرتی برگ و بار کی صورت میں ہوتا ہے۔

جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے اسی فطری راستے کی داعی ہے اور اپنے طور پر وہ کئی سال سے بھرپور

کام اسی مقررہ نہج پر کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پختہ اور محکم کام کا راستہ یہی ہے۔ اس راستے پر کام کرتے ہوئے ہمیں یا کسی اور قوت کو ہزار قسم کی مشکلات پیش آسکتی ہیں، بے شمار موانعات کا سامنا ہو سکتا ہے، سنگین آزمائشوں سے گذرنا پڑ سکتا ہے، مگر کلمہ طیبہ سے اگنے والے شجرۂ طیبہ کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خون اور لاشوں کی شکل میں جتنی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں، وہ اسے اور زیادہ نشوونما دیتی ہیں۔ وقتی طور پر اگر خونخوار جبریت اس مبارک پودے کو قطع بھی کر ڈالے تو یہ پھر پھوٹ آتا ہے، اس کی جڑیں اور بیج کبھی مرتے نہیں، وہ صدیوں بعد بھی کونپل نکال سکتے ہیں۔ اس پودے کو کاشت کرنے والے بے مزد کسان اپنے سامنے حکومتوں اور وزارتوں کو ابھرتے اور مٹتے دیکھتے ہیں، جنگ و جدل کے سیلاب اس کے روبرو امڈتے ہیں، اقتصادی لحاظ سے کشادگی اور بحران کے بڑے بڑے دور ان کی نگاہوں سے گذرتے ہیں، عالمی قوتوں کی ساز باز کے رنگا رنگ کھیلوں کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں، مگر ان سارے حوادث کو اپنے خدائی کام کے بالمقابل وہ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے گلیوں کے آوارہ بچوں کی حرکات ہوں۔

اقامتِ دین کا کام اگر اس فطری طریق پر ایک بار پروان چڑھ جائے تو پھر اس کے آگے کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ معاشرے کے اندر کی مزاحمتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور باہر کی شرپسند قوتیں بھی اپنے چنگال سمیٹ لیتی ہیں۔ فرد فرد کے اندر سے نور کا ایک چشمہ پھوٹ بہتا ہے، علمِ حق کی شعاعیں قریہ قریہ تک پھیل جاتی ہیں، جن لوگوں میں ایمان نہیں ہوتا ان میں ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کا ایمان حالت خواب میں ہوتا ہے وہ بیدار ہو کر متحرک قوت میں بدل جاتا ہے۔ زندگی کے جس شعبے میں دو چار افراد دعوت حق سے سرشار ہو جاتے ہیں وہ اپنے دائرے کے لوگوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے، کسی بستی میں اگر ایک صاحبِ ایمان بھی موجود ہوتا ہے تو وہ وہاں دب سکڑ کر پڑا نہیں رہتا بلکہ گرد و پیش کے بحیرۂ منجمد کے ہر قطرے سے نور و حرارت کا طوفان اٹھا دیتا ہے۔ وہ فرد دراصل فرد نہیں ہوتا، بلکہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی تحریک اس کی پشت پر ہوتی ہے اور ہزاروں رفیقوں کی محبت و رفاقت اس کا سرمایۂ قوت ہوتی ہے۔

---

اقامتِ دین کی تحریک باطل سے ٹکراتی ہوئی جب آگے بڑھتی ہے تو قدم قدم پر اس کا تنظیمی دائرہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب آخری مرحلہ آتا ہے تو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والا کوئی آدمی تن تنہا نہیں ہوتا کہ وہ دیانت داری سے خیر و فلاح کی باتیں کرنے کے عزائم باندھے، مگر اس کے دست و بازو نہ ہوں۔ نہیں، بلکہ صاحبِ اقتدار کے پیچھے بے شمار

چشم و گوش ہوتے ہیں جو ملک کے چپے چپے میں روزمرہ کے حوادث اور جمہور کی پریشانیوں کو دیکھتے ہیں، اس کے لاکھوں دماغ ہوتے ہیں جو دین برحق کے متعین خطوط پر مسائل و معاملات کو سوچتے اور لمحہ بہ لمحہ اپنے مشورے ایک مرکز پر پہنچاتے ہیں۔ اس کے کتنے ہی ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ جہاں چل کر خود نہیں پہنچ سکتا، اس کے تحریکی ہمزاد بالکل بروقت وہاں پہنچ جاتے ہیں اور جہاں جس کو سہارا دینا ہوتا ہے وہ درجنوں ہاتھ سہارا دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں اور جہاں کسی ظالم کے ہاتھ کو پکڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہاں فوری طور پر بیسیوں ہاتھ ظالم قوت کے دست و پا کو ناقابلِ حرکت بنا دیتے ہیں۔ رشوت و خیانت کے واقعات ہوں تو اُن پر نظر رکھنے والے رضاکار حاضر! چوری اور جرائم کا سلسلہ ہو تو مجرم کا راستہ روکنے کے لیے تیار۔ دفتری نظام میں بے قاعدگیاں اور بدعنوانیاں ہوں تو اُن کا ازالہ کرنے کے لیے کمربستہ۔ آدمیوں کو پہچاننے کا مسئلہ ہو کہ کون حق کا ساتھ دینے والا، کون مزاحمت کرنے والا اور کون منافق ہے تو وہی رضاکار ایک ایک شخص کا ہسٹری شیٹ تیار کرنے کے لیے آن ڈیوٹی!

اسلام کی معلّمانہ تحریک اپنے نفاذ کے لیے ایسی ہمہ گیر، فعال اور بصیرت مند قوت فراہم کرتی ہے، تب کہیں جا کر استخلاف فی الارض کا رتبہ بندگانِ خدا کو عطا ہوتا ہے۔

یہ طریق کار لمبا ہے۔ آج کل کے انقلابوں اور خونی طوفانوں سے اثر پذیر ذہن عجلت پسند ہو گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی بھی طرح کام ہو، جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چھوٹا سا ایک مقررہ ٹائم ٹیبل ہو کہ دس بیس سال میں غلبۂ حق ہو جانا چاہیے۔

---

دوسرا بھی ایک راستہ ہے ضرور، مگر تاریخ میں وہ اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھار ایسے سلاطین نمودار ہوتے رہے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے یہ سعادت دی کہ وہ اپنی قوت سے کام لے کر اسلام کا امکانی حد تک احیا کریں، یا بندگانِ خدا کو عادلانہ اور رفاہی طریقوں سے فیض پہنچائیں۔ ایسا اوقات بہ غیر معمولی صورت ایسے حالات میں واقع ہوئی کہ عرصہ دراز تک لوگوں پر حق و صداقت کے راستے بند رہے اور تاریکی اتنی گہری ہو گئی کہ روشنی کا ذوق بھی ختم ہونے لگا۔ کبھی ایسا ہوا کہ مظلومیت اور مایوسی کا دَور گذارنے والی کسی قوم کے لیے بہتری کی صورت پیدا کی۔ کبھی حالات کا نقشہ ایسا بن گیا کہ قوم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور بے شمار لیڈر طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں، مگر نہ اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جو ساری قوم کو پکار کر اپنے گرد سمیٹ سکے اور اس کی قافلہ سالاری کرے، اور نہ ہی ممکن ہے کہ سارے لیڈر مفاد پرستی کے چکر سے نکل کر خیر و فلاح کے نکات پر جمع ہو

سکیں۔ ایسی صورت میں مشیت غیر معمولی طریق سے کسی بہتر آدمی کو آگے کر دیتی ہے۔

مثالیں بہت ہیں۔ انبیاء میں سے صرف ایک ہی مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کی لی جا سکتی ہے۔ قدیم سلاطین میں سے قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اُس کی عدل پسندی اور رفاہ عامہ سے دلچسپی واضح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں سیدنا عمر بن عبدالعزیز شدید بگاڑ کے بعد بنو امیہ کے سلسلۂ سلاطین میں سے ہی اُبھرتے ہیں، مگر اپنے آپ کو فوراً خلفائے راشدین کا متبع بنا کر احیائے دین اور خدمتِ انسانیت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ پھر اگر سلطان صلاح الدین کے زمانے کے حالات دیکھے جائیں کہ مسلم معاشرہ حروبِ صلیبیہ کے باوجود داخلی انتشار سے دوچار تھا تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس شخص نے کس طرح صلیبی معرکوں کے خلاف ایک جانباز سپاہی کا فرض بھی ادا کیا اور خود مسلمانوں کے اندر ابھرنے والی بعض افتراقی قوتوں کو بھی ساتھ کے ساتھ کچلا۔ اس شخص نے اقتدار کا پارٹ جس درویشی سے اعلیٰ درجہ کے معیار کے مطابق ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کو روشن کرنے کا سبب ہے۔

اسی طرح تاتاریوں کی تاخت و تاراج کے آخری دَور میں مصر سے ایک غلام زادہ سلطان بیبرس جس شان سے اُبھرتا ہے اور مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو از سرِ نو توانائی دیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مُردوں کو زندہ کر دیا جائے۔ اس شخص نے تاتاریوں کو بے بس کر دیا، اور اسلامی اقدار کا احیا کیا۔ اور برصغیر میں متعدد مثالوں میں سے روشن ترین مثال اورنگ عالمگیرؒ کی ہے۔ بادشاہت کے اور بگاڑ تو جو کچھ تھے وہ تھے، مگر اکبری دَور نے تو اسلام کے عقاید و احکام سے لے کر آداب و شعائر تک ہر چیز کو بُری طرح کچلا اور اسلامی تہذیب کے پامال کردہ اجزاء کو ہندو قوم کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس تباہ کُن دَور کی خرابیوں کا کچھ ازالہ ہمایوں نے کیا، مگر مثبت پہلو سے یہ شرف اورنگ زیب عالمگیر ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ہندوؤں کو کسی تعصب کا نشانہ بنائے بغیر اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا ممکن حد تک پوری طرح نفاذ کیا۔

اس قسم کے ادوار جو بعض شخصیتوں کے ذاتی کارنامے کے طور پر تاریخ میں اُبھرے وہ اپنی روشنی پھیلا کر جب مٹے تو ایسے مٹے کہ بعد میں وہ رنگ ڈھنگ جاری نہ رہ سکا۔ تحریکی عمل اور شخصیتوں کے کام میں یہی فرق ہے۔

---

یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اقتدار سے کام لے کر جن ہستیوں نے اسلام کو رائج کیا یا بعض سلاطین نے عدل اور خدمتِ عوام کی اعلیٰ مثالیں چھوڑیں، ان کا بھی ایک خاص طریق کار تھا۔ وہ حضرات اگر اس طریقِ کار کو اختیار نہ کرتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ اس طریقِ کار کی چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ شخصی اقتدار چلانے کے لیے ویسے بھی کچھ زیادہ ہی مضبوط قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور انقلابی کام کرنے یا صلاح و فلاح کے اُمور کو انجام دینے اور منکرات کو مٹانے کے لیے بڑا آہنی عزم درکار ہوتا ہے۔ کوئی ڈھلمل آدمی، جس نے مطالعہ اور گہرے تفکر سے ایک وسیع ذہنی پس منظر مہیا نہ کیا ہو، بلکہ چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھنے والے افراد کی مرضیات کے رد و قبول میں پڑا رہے، قوتِ فیصلہ کو ضائع کر بیٹھتا ہے۔

۲۔ عام فلاحی و تعمیری پروگرام میں ایک حد تک، اور اسلام میں بطورِ خاص معاملات کو طے کرنے کے لیے سند، معیار اور اسوہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ معیار یا نمونہ پیشِ نظر ہو تو اس پر ناپ کر بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا چیز کرنی لازم ہے اور کس چیز کا انسداد ضروری ہے۔ جہاں نہ سند ہو، نہ معیار، نہ اسوہ، وہاں کبھی کوئی ایک رائے خوشنما لگے گی اور کبھی کوئی دوسرا مشورہ من موہنا محسوس ہوگا۔

۳۔ تاریخ میں تن تنہا اُٹھ کر خدمتِ اسلام کرنے یا عدل و انصاف کا سکہ چلانے والے اصحاب کے لائحہ عمل میں مجرموں کی سرکوبی اور اس کے لیے تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION) کا اصول بڑی اہمیت سے شامل رہا ہے۔ کسی نے بغاوت کے لیے جونہی سر اُٹھایا تو حکومت کی قوت اس کی گردن ناپنے کو موجود، کسی نے فساد فی الارض کا ارتکاب کیا تو اقتدار اس کے پیچھے سے بھی اور اس کے سامنے سے بھی سرکوبی کے لیے برسرِ عمل۔

۴۔ جہاں رعایا کی پریشانی اور عوام کے کسی اضطراب کی اطلاع ملی، بلا تاخیر حکمران کا دستِ شفقت اُن کے سروں پر پہنچ کر تسکین کا سامان بن جاتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ درباریوں یا مشیروں یا کارندوں میں سے اگر فرمانروا کو کسی کے متعلق یہ اندازہ ہو گیا کہ اُس نے منشائے حکومت کے خلاف کوئی اقدام کیا، یا کسی پالیسی کا رُخ ذرا سا بدل کر اُسے عوام کے لیے وجہِ پریشانی بنا دیا ہے، یا کوئی غلط مشورہ دیا ہے اور غلط منصوبہ منوایا ہے، یا اُس نے غلط کار ملازموں یا مجرم شہریوں میں سے کسی کی پشت پناہی کی ہے یا کسی کو اپنی اوٹ میں لیا ہے تو پھر بلا رو رعایت اُسے اُٹھا کے ایک طرف پھینک دیا جاتا تھا۔ اور بالعموم عبرت ناک سزا بھی دی جاتی تھی۔

---

لہ یہاں ایک مؤثر پنجابی محاورہ نقل کرنا مفید ہوگا: "ہلیا نئیں کہ سلیا نئیں" (مراد یہ کہ جونہی کسی سانپ نے ذرا جنبش کی، نیزے یا تلے سے اُسے فوراً چھید دیا)۔

سلاطینِ عادل کی کامیابی کا ایک راز ان کی مردم شناسی میں پنہاں ہے۔ وہ کام کے آدمیوں اور قابلِ اعتماد مشیروں اور بصیرت مند درباریوں کا صحیح انتخاب کرتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں جو اُن کے اختیار کردہ لائحہ عمل کو کامیاب کرنے اور اُن کے طے کردہ مقاصد کو دل و جان سے حاصل کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔

---

یہ چند ضروری شرائط اگر پوری نہ ہوں تو تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ اچھے سے اچھے مقاصد رکھنے والی شخصیتیں بھی ناکام ہو گئیں۔

تاریخ کے بہت ہی پیچیدہ اور لاینحل حالات میں مشیت اس قسم کے خصوصی انتظامات کرتی رہتی ہے تاکہ انسانیت بالکل غارت ہو کر نہ رہ جائے، لوگ بالکل مضمحل اور بے جان نہ ہو جائیں، ان کا یقین حق و انصاف سے نہ اُٹھ جائے اور وہ دعوت اسلامی کی علمبرداری کے قابل ہی نہ رہیں۔

قدرت کے اس خصوصی انتظام میں ایک ہی اساسی کلیہ واجب القبول ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی بھی سچے مسلمان کو مخصوص حالات کے تحت اقتدار کی باگ ڈور سونپ دی جائے تو اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ حاصل شدہ قوت کو خدا اور رسول کے احکام و حدود سے منحرف ہو کر استعمال کرے اور ساری قوت کو اپنے مفاد و آرام کا ذریعہ بنا لے، بلکہ اس کا لازمی فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کرے، اس کے احکام کے مطابق اقتدار کو دعوتِ دین کے فروغ، بندگانِ خدا کی اخلاقی اور معاشی فلاح، ان کو منکرات اور جرائم سے نجات دلانے اور ایک ایسی فعال، متحرک اور متحد ملت اسلامیہ میں بدلنے کی کوشش کرے جو اقامتِ دین کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو اور دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے دینِ مبین کی صداقت کی گواہی دے سکے۔

ہاں ایسے مسلمان کو اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اسلام کی برتری کے عزائم ظاہر کرتا ہے اور خرابیوں کی بیخ کنی اور ظالموں کی سرکوبی اور فواحش و منکرات کے انسداد کا اعلان کرتا ہے، وہ اگر اقامت صلوٰۃ یا ایتائے زکوٰۃ، یا کسی دوسری تعمیری و اخلاقی اسکیم کو سامنے لاتا ہے تو اُسے اپنے دعووں کو پورا کر کے دکھانا چاہیے، ورنہ اگر اس کی ہر بات معاشرے کے فاسد عناصر کے سامنے ایک ڈھیلی ڈھالی سفارش بن کر رہ گئی اور اس کی شخصیت بے وزن ہو کر رہ گئی تو یہ کمزوری خود اسلام اور اس کے مقاصد کے لیے نقصان دہ ہو گی، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے کام کرنے والے لوگ اُس کے لیے کام کر رہے ہوں گے یا کرنا چاہیں گے تو ان کا جادۂ سعی زیادہ کٹھن ہو جائے گا۔

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ایک سفارش یا نعوذ باللہ ایک گذارش نہیں ہے، وہ فرمان و ہدایت ہے۔ پس خدا کے جو بندے خدا کے دین کے لیے کام کرنے چلے ہوں وہ احکام دین کو سفارش یا گذارش بنا کے پیش نہ کریں۔ کوئی کام اگر کرنے کا ہے اور اس کے کرنے کی قوت حاصل ہے تو جرأت مردانہ سے اُسے کر ڈالیں، اور قوت حاصل نہیں ہے تو پھر دعوتِ دین کے ابتدائی مراحل طے کر کے قوت حاصل کرنے کی فکر کریں۔

---

تاریخ کے جھروکے میں سے جھانک کر مناظر رفتہ کو دیکھتے ہوئے کچھ اسباق جو اپنے ذہن نے اخذ کیے، بیان کر دیے گئے ہیں۔

لیکن جہاں تک جماعت اسلامی کا معاملہ ہے، وہ کسی بھی حکومت کے اچھے عزائم، دینی رجحانات اور فلاحی و تعمیری پروگراموں کو سراہتے ہوئے، خود اپنے لیے اسی طریق کار کو صحیح سمجھتی ہے جو اقامتِ دین کا فطری طریق کار ہے۔ ہمیں لوگوں کو خدا کے دین کی دعوت دیتے رہنا ہے، جو اُسے قبول کریں ان کو منظم کرنا، جو لوگ منظم ہوں ان کی تربیت کرنا ہے، اور اس طرح جو قوت تیار ہوتی جائے اُسے فروغ دعوت کی مہم میں شریک کرنا ہے اور اس کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کی ایک تحریک کو موجزن کرنا ہے۔ بحمداللہ کہ اس کام کا تسلسل کبھی نہ ٹوٹا ہے، نہ انشاء اللہ ٹوٹے گا۔

اس دوران میں اگر ایک ایسی قوت نمودار ہوئی ہے جس نے ظلم و خیانت کے شش سالہ دور کو ختم کر دیا، اور اچھے عزائم رکھتی ہے، اور شدید مزاحمتوں اور پیچیدگیوں کے باوجود اسلام کی خدمت کا دم بھرتی ہے تو ہم اس کے لیے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ دُعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مختصر دور میں کچھ اچھے اور مفید اقدامات کر سکے۔

ساتھ ہی ہم اپنے آپ کو اس مغالطے میں نہیں ڈال سکتے کہ ہماری دعوتی و تحریکی ذمہ داریاں ختم ہو گئیں ہیں۔ یہ معاشرہ جس میں چوری چکاری ہے، فحاشی و عیاشی ہے، رشوت و خیانت ہے، مار دھاڑ ہے، غنڈہ گردی اور رکمزور آزاری ہے، نفع اندوزی اور گراں بازاری ہے، تفرقہ پسندی اور محاذ آرائی ہے، جہالت اور غلاظت ہے، قانون شکنی اور بے ضابطگی ہے، اس کا ہمہ جہتی بگاڑ ایسا نہیں کہ عوامی دائروں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر دعوتِ اصلاح کی ضرورت ختم ہو چکی ہو۔ بلکہ حالات گواہی دے رہے ہیں کہ یہ ضرورت اُس سے کہیں زیادہ ہے، جتنی ہم سمجھتے تھے۔

میرا منشا یہ ہے کہ دین سے محبت رکھنے والوں میں جتنا بھرپور احساس ذمہ داری ہونا چاہیے، وہ برسرِ عمل رہے اور اس کے زیر اثر جو کام ہونا چاہیے وہ صبر و سکون سے جاری رہے۔